© rasailojaraid.com

نبوّت کی ضرورت

عبدالحمید صدیقی

(۲)

ایک نبی کی اصلاحی کوششیں متصوف کے گیان دھیان سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور اُن کا دائرۂ کار بھی متصوف کے دائرہ کار سے بہت زیادہ وسیع ہوتا ہے متصوف کی جدوجہد کا کعبۂ مقصود یہی ہے کہ وہ ریاضت کے ذریعہ ایک قسم کے روحانی سرور سے لطف اندوز ہوتا ہے اور جو لوگ اُس کے زیراثر آئیں یا اپنے آپ کو اُس سے وابستہ کریں وہ انہیں بھی اُسی کیف و مستی سے لذّت آشنا کردے۔ اس کے مقابلے میں نبی کا کام بڑا وسیع اور صبر آزما ہوتا ہے۔ فکر و نظر کے زاویوں سے لیکر عملی زندگی کی معمولی سے معمولی جزئیات تک نبی اپنی پوری توجہ صرف کرتا ہے اور ان میں اس انداز سے تغیرات لاتا ہے کہ وہ ہر لحاظ سے تعلیمات الٰہی کے سانچوں میں ڈھل جائیں حیات انسانی کا کوئی گوشہ اور قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں ہوتا جہاں اُن تعلیمات کے اثرات نمایاں نہ ہونے پائیں۔ نبی ایک طرف بنی نوع انسان کو اس کائنات، اس کے خالق اور خود اپنی ذات کے بارے میں ایک صحیح نقطۂ نظر عطا کرتا ہے۔ پھر ان کے باہمی تعلق کو صحیح بنیادوں پر استوار کر کے اس کے فکری اور عملی مضمرات ذہن نشین کراتا ہے۔ اس کے بعد وہ تعمیر سیرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ دل و دماغ کے جس جس گوشہ میں باطل احساسات اور گمراہ کن تصورات کی جھاڑ جھنکار موجود ہو، اُس سے نفس انسانی کو پاک اور صاف کرتا ہے اور پھر اُس میں ایمان و یقین کے بیج بوتا ہے اور تقویٰ اور پرہیزگاری سے ان کی آبیاری کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسی طرح دیکھتے دیکھتے سیرت و کردار کی لہلہاتی کھیتیاں تیار ہو جاتی ہیں۔

انفرادی اصلاح سے آگے بڑھ کر انبیاء علیہم السلام معاشرتی، سیاسی اور معاشی میدانوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں بھی ایک صالح انقلاب کے علمبردار ہوتے ہیں۔ وہ سوسائٹی سے ہر قسم کی جاہلانہ رسوم کا قلع قمع کرتے ہیں۔ انسانوں کو انسان کی بندگی سے نکال کر انہیں خدا کی بندگی اختیار کرنے کی نہ صرف تلقین کرتے ہیں بلکہ ایک ایسی اجتماعی زندگی کی داغ بیل بھی ڈالتے ہیں جس میں انسان کی بندگی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ معاشرہ میں اونچ نیچ کے جو غلط امتیازات قائم ہوتے ہیں، انہیں ایک ایک کرکے مٹاتے ہیں اور انسان کی معاشی زندگی کو ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ سے بچا کر عدل و انصاف کے اصولوں پر استوار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ نوعِ انسانی کو صلح و جنگ کے نئے آئین اور نئے ضابطوں سے آشنا کرتے ہیں۔ الغرض حیاتِ انسانی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہوتا جہاں اُن کی تعلیمات کے گہرے اثرات مترتب نہ ہوں۔ وہ نوعِ انسانی کو ایسی زندگی بخش اقدار عطا کرتے ہیں جنہیں دیکھ کر ایک شخص فوراً اس بات کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ سب تعلیماتِ ربانی ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات اور اُن کے کارناموں کو ہم خارجی دنیا میں نہ صرف واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں بلکہ عقلِ سلیم کی میزان پر تول کر اُن کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن متصوفین کے جس گروہ کا ہم نے ذکر کیا ہے اُن کے کاموں کی عقل و خرد ممکن ہے کوئی دور رَس تعبیر کر کے اُن کے لیے کوئی فلسفیانہ بنیاد فراہم کر سکے، مگر آج تک عقل کوئی ایسا پیمانہ ایجاد نہیں کر سکی جس سے اُن کی صحیح صحیح پیمائش ممکن ہو۔ متصوفین کا دائرۂ عمل چونکہ داخلی زندگی تک محدود ہے اور اُن کی تگ و تاز کا مقصد کیف و مستی کے حصول کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا اس لیے عقل اس کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتی۔ یہ کیف و مستی متصوفین کی نظر میں زندگی کے اُن سربستہ اسرار میں سے ہے جن کی تحلیل دشوار ہے اور جن کی نزاکت اور لطافت علمی موشگافیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی، یا یوں کہیے کہ خشک علمیت اُن کی عقدہ کشائی کی صلاحیت اور اہلیت نہیں رکھتی۔ اسی بنا پر اہلِ خرد کو اہلِ جنوں[1] کا یہ طعنہ قدم قدم پر سننا پڑتا ہے

[1] یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ متصوفین سے مراد وہ مسلمان صوفیاء کرام نہیں جنہوں نے اسلامی تعلیمات کا پرچار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

از بے خبری، بے خبراں معذورند
ذوقیست دریں بادہ کہ مستاں دانند

تصوف سراسر ایک داخلی کیفیت کا نام ہے، اس لیے اسے کسی معروضی معیار پر پرکھ کر اس کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کے مقابلے میں انبیاء علیہم السلام نے نوع انسانی کو جو تعلیم دی ہے وہ اگر ایک طرف اُس کے فکر میں سلجھاؤ اور اس کے قلب میں طمانیت پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف ایک ایسی تہذیب کا سنگِ بنیاد بھی رکھتی ہے جو انسان کی اجتماعی زندگی کو ہر قسم کی کشاکش سے پاک کر کے اُسے پُرسکون بناتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ تصوف کے اندر کسی تمدن کی تشکیل کی قطعاً کوئی صلاحیت سرے سے موجود ہی نہیں ہوتی۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ خالص روحانیت نے آج تک کسی محدود سے محدود رقبہ زمین میں کسی تمدنی زندگی کو جنم نہیں دیا۔

انبیاء علیہم السلام اور متصوفین کی تعلیمات کے درمیان تیسرا فرق یہ ہے کہ انبیاء کی تعلیمات میں ایک یقین اور وثوق ہوتا ہے وہ انسانیت کو ایمان (ایقان) کی دولت سے سرفراز کرتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں متصوفین سے جو چیز انسان کو حاصل ہوتی ہے اُس کی حیثیت ایک وقتی تاثر یا قلبی کیفیت کی ہے، اُس میں وہ یقین مفقود ہوتا ہے جسے تعلیماتِ نبوی کی جان کہا جاسکتا ہے۔ اس امتیاز کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ تصوف کا تعلق جس حاسہ سے ہے وہ بہرحال ایک انسانی حاسہ ہی ہے، اسی طرح کمزور، محدود اور خطا پذیر جس طرح کہ انسان کے دوسرے حواس ہیں۔ اس لیے اس کے دائرۂ عمل میں غلطی کا صدور ہر وقت ممکن ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو متصوفین کے مشاہدات میں بھی اُسی طرح ہم آہنگی ہوتی جو ہمیں انبیاء کی تعلیمات میں

۲۔ کیا اور جن کی اپنی زندگیاں اسلام کا نہایت ارفع و اعلیٰ نمونہ تھیں۔ یہاں متصوفین کے جس گروہ سے بحث کی جارہی ہے وہ اُن اصحاب پر مشتمل ہے جو صرف گیان دھیان کو زندگی کا کمال سمجھتے ہیں اور زندگی اور اس کے عملی مسائل سے یکسر لاپرواہ ہو کر زندگی گزارنے کے عادی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظر آتی ہے۔ مشہور عارف ربانی حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ نے اپنے مکتوبات میں اس امر کی مختلف طریقوں سے تصریح فرمائی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ مشاہدۂ باطن صفائی نفس اور ایک ایسے اندرونی حاسہ کو بیدار کر دینے سے ممکن ہے، جو روحانیت اور ماوراء الطبیعیات کا اُسی طرح ادراک کرتا ہے، جس طرح یہ ظاہری آنکھیں ظاہری چیزوں کا ادراک کرتی ہیں یہ اندرونی روشنی ریاضت، نفس کشی اور مراقبہ اور تفکر سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس مشاہدہ باطن سے جو علم ہمیں حاصل ہوتا ہے وہ اس طرح کا یقینی علم نہیں جو نبوت کی بارگاہ سے ملتا ہے۔ اس میں وہ ساری خامیاں پائی جاتی ہیں جو علوم عقلی میں موجود ہیں۔ کیونکہ کشف یا مشاہدہ باطن کی بنیاد بھی ایک انسانی حاسہ ہی ہے جس کی کچھ حدود ہیں اور جس میں نفس انسانی کی کمزوریاں بالضرور شامل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

"اب ہم اصل بات کو بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بعض اوقات مشاہدہ باطن میں بھی خطا ہو جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ صاحبِ کشف بعض قلبی واردات کو الہامی کیفیات سمجھ لیتا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں بعض اوقات یہ دونوں کیفیات باہم ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گڈمڈ ہو جاتی ہیں کہ صاحب کشف ان کے درمیان تمیز نہیں کر سکتا اور وہ غلطی سے ان ساری واردات کو الہامی خیال کر لیتا ہے۔ پس یہ بات ذہن نشین رہے کہ کشف و مراقبہ کے بعض اجزا میں خطا ہونے کے باعث پورے علم میں ہی خطا کا احتمال باقی رہتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صاحبِ کشف جو کچھ دیکھتا ہے اُس کی ظاہری شکل و صورت کو آخری اور قطعی سمجھ لیتا ہے حالانکہ یہ مکاشفہ اپنے فراخ کے اعتبار سے تاویل و تعبیر کا محتاج ہوتا ہے۔"

(مکتوبات امام ربانی دفتر اول مکتوب ۲۱۷)

متصوفین کے مقابلے میں جو تعلیم نوعِ انسانی کو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ملتی ہے وہ ہر لحاظ سے مکمل و اکمل، اور ہر خطا سے یکسر پاک ہوتی ہے۔ اس سے انسان کو یقین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ایمان کی دولت ہاتھ آتی ہے اور وہ اس کائنات، اس کے خالق و مالک، خود اپنے مرتبہ و مقام کے متعلق یقینی علم حاصل کرتا ہے۔ یہ تعلیم اُسے ریب و تشکک کی بھول بھلیوں سے نکال کر اُس کے راستے کو عزم و یقین کی روشنی سے منور کرتی ہے۔ مجدد الف ثانیؒ نے ان دونوں قسم کی تعلیمات کی نوعیت میں جو اساسی فرق ہے اُس کی علت بھی بتائی ہے۔ اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

"فرشتہ چونکہ خطا و نسیان سے پاک اور ان کمزوریوں سے مبرا ہوتا ہے جن کی وجہ سے ایک انسان غلطی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس بنا پر وہ یقیناً اعتماد کے لائق ہے اور اس کے پیش کردہ احکام وہم و خیال کی دستبرد سے محفوظ و مامون ہوتے ہیں ۔۔۔ اس بنا پر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ہدایت و رہنمائی کے بغیر انسان تزکیۂ نفس کی حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ اور وہ صفائی جو کافروں اور فاسقوں کو حاصل ہوتی ہے وہ نفس کی صفائی ہے نہ کہ قلب کی صفائی۔ وہ مراقبہ یا ریاضت جس کی بنیاد تعلیمات نبوی نہ ہو، اُس سے گمراہی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور خسران کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا اور بعض ماورا الطبیعیات چیزوں کا کشف جو گیان و دھیان کے وقت کافروں اور فاسقوں کو حاصل ہوتا ہے وہ استدراج ہے جس سے مقصود ان لوگوں کی خرابی اور خسران ہے۔

(دفتر اول مکتوب ۲۶۶)

ایک دوسرے مقام پر وہ اسی حقیقت کو بڑے زوردار الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:

"الغرض وہ چیزیں جن پر قطعیت کے ساتھ اعتماد کیا جا سکتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی ہیں جن کا منزل من اللہ ہونا قطعی اور یقینی ہے۔ رشد و ہدایت کی یہ تعلیم خدا فرشتے کے ذریعہ انبیاء علیہم السلام پر نازل کرتا ہے اس بنا پر وہ ہر قسم کی خطا اور غلطی سے پاک ہوتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علماء کا اجماع اور مجتہدین کا اجتہاد بھی انہیں دو اصولوں کی طرف راجع ہے۔ ان چار شرعی اصولوں کے سوا اور جو کچھ بھی ہو خواہ وہ صوفیا کے علوم و معارف ہوں یا ان کے مکاشفے اور مراقبے۔ اگر یہ چیزیں مندرجۂ بالا چاروں اصولوں کے مطابق ہوں تو وہ قابل قبول ہیں ورنہ مردود۔ "وجد و حال کو جب تک شرع کی میزان پر نہ تول لیا جائے، وہ ایک حبہ سے بھی کم اہمیت کا حامل ہے اور کشف و مراقبہ کو جب تک کتاب و سنت کی کسوٹی پر نہ پرکھ لیں اس کی حیثیت مسِ خام سے بھی کم ہے"

"مشاہدہ و مراقبہ بذاتِ خود مطلوب و مقصود نہیں بلکہ بعض لوگ ان کی مدد سے تعلیماتِ الٰہی کے بارے میں شرح صدر حاصل کرتے ہیں۔ رؤیتِ الٰہی کا وعدہ صرف آخرت کے لیے ہے اور حواس کی دنیا میں عام انسانوں کے لیے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ باقی رہیں وہ تجلیات یا وہ مشاہدے جن پر صوفیاء کرام نازاں ہیں وہ درحقیقت ظلال یا شبیہ و مثال ہیں۔ حق تعالیٰ وراء الوراء ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر ان مشاہدات اور تجلیات کی حقیقت پر سے نقاب کشائی کر دوں تو اس راہ کے مسافر کا ذوقِ طلب کم ہوگا اور ان کے جذبہ شوق پر افسردگی طاری ہو جائے گی لیکن دوسری طرف مجھے اس بات کا بھی خطرہ لاحق ہے کہ حقیقت کو جاننے کے باوجود اگر میں خاموش رہوں تو حق باطل سے ممیز نہ ہوگا . . .

حضورؐ سرورِ دو عالم کو اس دنیا میں دیدارِ الٰہی نصیب ہوا اور وہ اپنی جگہ پر قائم رہے لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آپ کے کامل متبعین میں سے جس کو بھی مشاہدہ باطن حاصل ہو اس کی نوعیت دوسری ہوگی۔ وہ خدا کے نور کا پرتو تو ہوگا لیکن وہ رؤیت ظلال میں سے کسی ظل کے پردے میں ہوگی۔ صاحبِ کشف اس حقیقت کو سمجھے یا نہ سمجھے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ جب موسیٰ کلیم اللہ جیسے جلیل القدر نبی دیدارِ الٰہی کی تاب نہ لا سکے اور وہ بیہوش ہو کر گر گئے تو پھر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عام انسانوں میں یہ قوت و طاقت کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ باری تعالیٰ کی تجلی کی تاب لا سکیں۔" (دفتر اوّل مکتوب ۲۱۷)

دنیائے اسلام کے مشہور مفکر سید رشید رضا مصری نے اپنی فاضلانہ تصنیف "الوحی المحمدی" میں وحی کی تعریف کرتے ہوئے اس حقیقت کی بڑے واضح الفاظ میں نشاندہی کی ہے کہ یقین، وثوق، قطعیت و حتمیت وحی الٰہی کی ضروری صفات ہیں۔ جو علم خالقِ کائنات اور غیب و شہود کے متعلق نوعِ بشری کو یقینی اور قابلِ اعتماد معلومات فراہم کرتا ہے وہ ہمیں وحی و الہام کے ذریعہ سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ معلومات کا یہی ایک ایسا سرچشمہ ہے جسے انسانی خواہشات و توہمات، اور انسانی عقل و فکر، اور اس کا مشاہدہ اور تجربہ اپنی فطری کمزوریوں کی وجہ سے گدلا نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ایسا علم ہے جسے خطا و نسیان سے بالکل محفوظ و مامون رکھا گیا ہے۔ کیونکہ یہ کسی انسان کے ذہن کی پیداوار نہیں ہوتا بلکہ خداوند تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا مظہر ہوتا ہے۔ سید رشید رضا مرحوم و مغفور وحی کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وحی وہ علم ہے جو کسی شخص کو پورے یقین اور وثوق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بالواسطہ یا بلاواسطہ حاصل ہوا ہو۔"

الوحی المحمدی کے فاضل مصنف نے اسی فصل میں اس باطل خیال کی بھی تردید کر دی ہے کہ انسان کی اپنی آرزوئیں و تمنائیں اور اس کے اپنے احساسات و افکار بسا اوقات الفاظ کے نایاب سانچوں میں ڈھل جاتے ہیں اور سطح بین آنکھیں انہیں وحی و الہام سے تعبیر کرنے لگتی ہیں۔ اس قسم کے نظریات رکھنے والے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وحی بھی شاعری اور تصوف کی قسم کی کوئی چیز ہے جو انسان کی اپنی ذاتی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا مظہر ہوتی ہے اور لوگ ان کی غیر معمولی برتری کی وجہ سے انہیں خدا کا کلام سمجھ بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ سید رضا صاحب فرماتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

« جو لوگ عالمِ غیب کے وجود کو نہیں مانتے یا محسوسات کی دنیا سے اس کے
باہمی تعلق کے منکر ہیں اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ حضور سرورِ دو عالم کی اپنی معلومات اُن
کے ذاتی افکار اور اُن کی اپنی ہی تمناؤں اور آرزوؤں نے اُن کے اندر ایک الہامی
قوت پیدا کر دی تھی جو اُن کی بصیرت اور عقل و فکر کی باطنی قوتوں سے غذا حاصل
کرتی۔ یا آپ کی پوشیدہ اور بلند و بالا روحانی طاقتوں کا عکس آپ کی اعلیٰ و ارفع
قوتِ متخیلہ پر پڑتا اور اس طرح آپ کے ذاتی اعتقادات و نظریات ہی آپ
کی آنکھوں پر منعکس ہوتے مگر آپ یہ سمجھ لیتے کہ کوئی فرشتہ سامنے کھڑا ہے یا
کانوں میں اُس کی آواز سنتے اور یہ (خیالی فرشتہ) جو کچھ کہتا اُسے قلب و دماغ
میں محفوظ کر لیتے ہیں »

« ہمارے اور اُن لوگوں کے درمیان بنیادی اختلاف یہی ہے کہ ہم شرعی وحی
کو حضورؐ کے اپنے افکار و احساسات کا نتیجہ نہیں سمجھتے بلکہ اس بات پر ایمان
رکھتے ہیں کہ وہ آسمان سے حضور پر اتاری گئی تھی اور اس وجہ سے وہ حضورؐ
کے نفس سے کوئی خارج چیز ہے۔ وہ حضورؐ کی داخلی اور باطنی قوتوں کا مظہر
نہیں بلکہ اسے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے قلب پر فرشتہ کے ذریعہ نازل فرمایا
تھا جس طرح کہ قرآن مجید میں مذکور ہے (۲۶: ۱۹۲) وانہ لتنزیل رب
العالمین (۱۹۳) نزل بہ الروح الامین (۱۹۴) علی قلبک لتکون من
المنذرین (۱۹۵) بلسان عربی مبین »

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جس طرح وحی نازل ہونا شروع ہوئی، اس کا جو ذکر قرآن
مجید اور احادیث میں ملتا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ علم کوئی اکتسابی نہ تھا جو
آپ کی عقلی و فکری قوتوں اور مشاہدۂ باطن کے ذریعہ آپ کو حاصل ہوا بلکہ اسے اللہ
تعالیٰ نے آپ کو خود عطا فرمایا تھا۔ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے دریافت کیا: "اے رسولؐ خدا! آپ پر وحی کیسے آتی ہے۔ رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: کبھی یہ آواز جرس کی طرح سنائی دیتی اور یہ میرے لیے سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ جب فرشتہ جدا ہو جاتا ہے تو میں اس کی بات پوری طرح محفوظ کر چکا ہوتا ہوں۔ کبھی فرشتہ انسانی پیکر میں جلوہ گر ہوتا۔ وہ مجھ سے ہمکلام ہوتا اور میں اس کی باتوں کو اچھی طرح یاد کر لیتا ہوں۔" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے سخت جاڑے میں آپ پر وحی نازل ہوتے دیکھی ہے وہ جب ختم ہوتی تھی تو حضورؐ کی پیشانی سے پسینہ بہتا تھا۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے وحی کی ابتداء یوں بیان کی گئی ہے کہ حضورؐ نیند کی حالت میں اچھے خواب دیکھتے تھے۔ جو خواب بھی آپ دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح صحیح ہوتے۔ پھر آپ کو تنہائی اور گوشہ نشینی محبوب ہو گئی۔ چنانچہ آپ غار حرا میں تنہا اپنے اہل و عیال سے الگ تھلگ کئی دن اور کئی راتیں عبادت میں صرف کرتے۔ آپ اپنا کھانا خود ساتھ لے جاتے تھے جب وہ ختم ہو جاتا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لا کر دوبارہ کھانا لے جاتے یہاں تک کہ غار میں حق آپ پر ظاہر ہو گیا یعنی ایک فرشتہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا: پڑھیے۔ میں نے کہا: میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس نے پکڑ کر مجھے اس قدر زور سے بھینچا کہ میرا جسم ٹوٹنے لگا اور پھر کہا پڑھیے، میں نے کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس پر اس نے دوبارہ پکڑ کر مجھے زور سے بھینچا یہاں تک کہ میرا جسم ٹوٹنے لگا۔ پھر کہا: پڑھیے، میں نے کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ پھر تیسری بار اس نے مجھے زور سے بھینچا اور پھر مجھے الگ کر کے کہنے لگا: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ۔ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔

آپ اس واقعہ کے بعد دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا "مجھے کمبل اڑھاؤ" آپ کو کمبل اوڑھا دیا گیا۔ جب آپ کی دہشت دور ہوئی تو آپ نے حضرت خدیجہ کو سارے واقعہ سے آگاہ فرمایا اور کہا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ مجھے اپنے بارے میں خوف لاحق ہو گیا ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا: ہرگز نہیں خدا آپ کو کبھی رُسوا نہ کرے گا، کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، بے کسوں کی دستگیری کرتے ہیں، تہی دستوں کی مدد فرماتے ہیں، مہمانوں کی خبر گیری کرتے اور لوگوں کی مصیبتوں میں اُن کے کام آتے ہیں۔[1]

اسی واقعہ کے تین سال بعد تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا۔ اور پھر اس کا آغاز ہوا۔ جابر بن عبداللہ انصاری نے سلسلہ وحی منقطع ہو جانے کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک دفعہ میں جا رہا تھا کہ اچانک آسمان سے ایک آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں میرے پاس آیا تھا آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں اس سے خوفزدہ ہو گیا اور گھر لوٹ کر میں نے کہا "مجھے کمبل اڑھاؤ۔ اسی وقت خداوند تعالیٰ نے یہ وحی نازل فرمائی"

یا ایہا المدثر . . . تا آخر والرجز فاھجر۔

وحی کی ان مختلف کیفیات کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ حضور سرورِ دو عالم پر وحی کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ نازل کیا گیا تھا وہ ان کی اپنی قلبی واردات یا ذہنی کیفیات کا پرتو نہ تھا۔ وحی کے آغاز کی جو احادیث امام بخاریؒ، امام مسلمؒ اور دوسرے محدثینؒ نے روایت کی ہیں اُن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ کے سامنے جب پہلی بار فرشتہ نمودار ہوا تو حضورؐ خوفزدہ ہو گئے۔ اگر نبوت اُن کی باطنی صلاحیتوں اور قوتوں کا ہی عکس ہوتی تو انہیں متحیر ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ اس صورت میں فرشتہ کا وجود کوئی حیران و ششدر کرنے والی چیز نہ ہوتی بلکہ اُن کے نشا اور مرضی کے عین مطابق ہوتی۔ اس حالت میں وہ فرشتہ سے خوفزدہ ہونے کی بجائے اپنی طبیعت کو اُس سے بالکل مانوس پاتے۔ فرشتے کے پہلی بار سامنے آنے پر آپ کا خوف و ہراس اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ حضورؐ اپنی باطنی قوتوں اور صلاحیتوں کو اس غیر معمولی

[1] بخاری۔ باب بدء الوحی لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور بلند و بالا مقام کے حصول کے لیے شعوری طور پر تیار نہ کر رہے تھے۔ اس لیے جب فرشتہ حضورؐ کی خدمت میں پہلی مرتبہ حاضر ہوا تو آپ نے اُسے ایک غیر متوقع اور اجنبی چیز سمجھ کر اُس سے خوف محسوس کیا۔

کسی صحیح اور مرفوع حدیث میں یہ تحریر نہیں کہ آپ نبوت کے متوقع اور منتظر تھے، اگر اس قسم کی کوئی روایت ہوتی تو محدثین کرام اُسے ضرور نقل کر لیتے۔ قرآن مجید اور احادیث کے مطالعہ سے اس بات کا صاف پتہ چلتا ہے کہ حضور کو اس نعمت سے اچانک، بالکل غیر متوقع طور پر سرفراز فرمایا گیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں اس امر کی تصریح کر دی گئی ہے۔

وما کنت ترجوا ان یلقیٰ الیک الکتاب الا رحمۃ من ربک (۲۸:۸۶)

تمہیں اس امر کی امید نہ تھی کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی مگر یہ سب تمہارے پروردگار کی رحمت کی وجہ سے ہوا۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر جو کتاب نازل فرمائی ہے اور تمہیں نبوت جیسے ارفع و اعلیٰ منصب سے سرفراز فرمایا ہے اس میں تمہارے اپنے علم و عمل کا کوئی دخل نہیں ہے نہ تمہیں اس کی توقع تھی اور نہ ہی آرزو۔ یہ جو کچھ اعزاز تمہیں بخشا گیا وہ خالقِ کائنات کی رحمت کا کرشمہ ہے۔

علامہ رشید رضا مصری نے اس ضمن میں ایک نہایت ہی معنی خیز بات کہی ہے وہ فرماتے ہیں اگر نبوت حضورؐ کے ذہنی اضطراب، داخلی ہیجان اور سوزشِ قلبی کا ہی نتیجہ ہوتی اور اسی وجہ سے آپ غارِ حرا میں دنیا سے الگ تھلگ رہ کر عبادت میں مصروف ہوئے، تو ان داخلی کیفیات کے نتیجے میں اُن کا ذہن رسا اور مضطرب دل کوئی زبردست سورۃ یا کوئی فصیح و بلیغ آیات تصنیف کرتا۔ اگر مستشرقین کی یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ ریگزاروں کی کھلی فضا نے آپ کے اندر وحدانیت کا احساس بیدار کیا اور آپ کی طبیعت کو کفر و شرک سے نفرت پیدا ہوئی، ستاروں کی خاموش فضاؤں نے آپ کے دل کے اندر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک طاقتور خالق کا خیال بٹھایا۔ ظالم طبقوں کی ریشہ دوانیاں دیکھ کر آپ کے حساس دل کے اندر ارتعاش ہوا اور آپ نے ان پسے ہوئے لوگوں کی دستگیری کا عزم کیا۔ اگر حضور سرورِ دوعالم پر وحی کا نزول آپ کے ان احساسات کا ہی کرشمہ تھا تو پھر سب سے پہلے وہ سورتیں نازل ہوتیں جن میں ایمان و ایقان کے اصول و مبادی، توحید کا اثبات شرک اور بت پرستی کی زبردست مذمت، پادریوں اور راہبوں کی من گھڑت شریعت، خداوند تعالیٰ کو بیٹا پکڑنے کا ذکر، اور کفر و طغیان میں سرشار سرداروں کی دنیا اور آخرت میں تذلیل اور رسوائی کے تذکرے ہوتے جیسا کہ مفصل سورتوں بالخصوص ق والقرآن المجید، والذاریات، الطور، النجم، القمر، الحاقۃ النبا میں ہیں۔"

"مگر برخلاف اس کے ہوا یہ کہ آغاز وحی کے تین سال بعد تک نہ تو حضورؐ نے لوگوں کو کوئی سورۃ سنائی، اور نہ ہی کوئی دعوت دی اور نہ ہی اس دینی تحریک کا اپنے خاندان اور رفقاء سے کوئی تذکرہ کیا جس کا کہ بقول ان کے آپؐ کے دل میں خیال سمایا ہوا تھا۔ آپ نے اس دوران میں شرک کی ان خرافات کی بھی مذمت نہ کی جس نے آپ کے دل کو مضطرب اور پریشان کر رکھا تھا۔ اگر آپ اس قسم کی کوئی بات بیان فرماتے تو اسے بالضرور روایت کر دیا جاتا۔ اگر دوسرے لوگ یہ خدمت انجام نہ دیتے تو وہ مقدس لوگ تو اس کام کو بالضرور کرتے جو آپ سے گہرے طور پر وابستہ تھے مثلاً اہلِ خانہ میں سے حضرت خدیجہ، حضرت علی و زید بن حارث رضی اللہ عنہم، اور گھر سے باہر حضرت ابوبکر صدیقؓ جو عمر بھر آپ کے دلسوز رفیق اور فدائی رہے وحی کے التوا کے زمانے میں ان مقدس حضرات کا سکوت اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ان مغربی علماء نے "نفسیاتی اور ذاتی وحی کے لیے آپ کی تیاری اور دوسرے لوگوں سے مختلف معلومات لیکر انہیں وحی و الہام کا نام دینے کے جو من گھڑت قصے بیان کیے ہیں وہ سرتا پا لغو اور بے بنیاد ہیں۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سلسلہ میں ایک اور چیز بھی ذہن نشین رہے کہ جو لوگ چالاکی اور عیاری سے، ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت نبوت کا دعویٰ کرنے کے متمنی ہوتے ہیں اُن کے دعوے میں کبھی بھی اتنا عزم اور یقین نہیں ہوتا جتنا کہ ایک سچے نبی کے دعوے میں ہوتا ہے۔ ایک سچے نبی کو نبوت ملنے سے پہلے اپنے مقام و مرتبہ کا کچھ علم نہیں ہوتا اس لیے وہ اپنے متعلق کوئی دعویٰ نہیں کرتا لیکن جب اللہ تعالیٰ اُسے اس امر کی اطلاع دے دیتا ہے کہ اُسے نبوت کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے تو پھر وہ اپنے متعلق کسی گومگو کی پالیسی کو اختیار نہیں کرتا۔ وہ پھر برملا لوگوں سے کہتا ہے کہ میں نبی ہوں اور میرے ماننے اور نہ ماننے پر ایمان و کفر کا مدار ہے۔ جو مجھ پر ایمان لائے گا وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوگا اور جو میرا انکار کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم کر دیا جائے گا۔ یہ اعلان وہ بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کرتا ہے اور اپنے اس موقف سے ذرہ برابر ہٹنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ ایک سچے نبی کے برعکس ایک متنبی کو اپنے مقام کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اگر حالات سازگار ہوں تو وہ نبوت کا دعویٰ کر دیتا ہے اور انکار کرنے والوں کو کافر ٹھہراتا ہے لیکن جب حالات ذرا ناموافق دکھائی دیں تو فوراً اپنا موقف بدل دیتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے انبیاء علیہم السلام کے بارے میں لوگوں کے دو ہی موقف رہے ہیں، یا تو انہوں نے اُن مقدس ہستیوں پر ایمان لا کر اسلام کا قلادہ اپنی گردنوں میں پہن لیا یا پھر انکار کر کے کفر کی راہ اختیار کی۔ کسی سچے نبی کے بارے میں لوگ کبھی ریب و تشکک میں مبتلا نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبوت چونکہ باطنی قوتوں کا پرتو نہیں ہوتی بلکہ خداوند تعالیٰ کا عطیہ ہوتی ہے اس لیے نبی کو اپنے مرتبہ اور مقام کے بارے میں پورا الیقین و وثوق ہوتا ہے وہ نبوت کا دعویٰ حالات کی سازگاری یا ناسازگاری دیکھ کر نہیں کرتا بلکہ اللہ کے حکم کے مطابق دنیاوی مصلحتوں سے یکسر بے پروا ہو کر لوگوں سے کھلے بندوں کہتا ہے کہ میں نبی ہوں اور جو مجھ پر ایمان لائے گا وہ دنیا و آخرت میں فائز المرام ہوگا اور جو میرا انکار کرے گا وہ جہنم کی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ اس ایک موقف کے علاوہ وہ کوئی دوسرا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موقف اختیار نہیں کرتا۔ وہ اس معاملے میں کسی مداہنت اور اخفا سے کام نہیں لیتا۔ وہ اپنے دعوے کا آغاز اسی ایک چیز سے کرتا ہے اور اسی دعوے پر قائم رہتے ہوئے اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملتا ہے۔ اس دعوے میں کسی قسم کی تدریج نہیں ہوتی۔

اس کے برعکس اگر آپ ایک جھوٹے نبی کے دعاوی کا تجزیہ کریں تو آپ کو اس کا کذب فوراً معلوم ہو جائے گا۔ اس کے موقف میں کوئی ٹھہراؤ اور قرار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مرتبہ اور مقام کے بارے میں بھی ایسی ایسی چالیں چلتا ہے جیسے کہ وہ شطرنج کی بازی کھیل رہا ہے پہلے ایک معمولی دعویٰ کر کے مخالفین کا ردعمل دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر حالات سازگار معلوم ہوئے تو پھر پہلے دعوے سے ذرا بلند دعویٰ کر کے لوگوں کے تاثرات کا اندازہ لگایا اور اس طرح عقل و احساس کی گوریلا وار لڑتے ہوئے اُن مقدس مقامات تک جا پہنچے جن کے بارے میں مسلم قوم کے احساسات انتہائی نازک ہیں۔ مثال کے طور پر پہلے خادم دین بننے اور دین کو دوسرے ادیان پر غالب کرنے کا غلغلہ بلند کیا جب لوگوں کی نظریں اس کی شخصیت پر جمنے لگیں تو جھٹ سے یہ کہہ دیا کہ میں مجدد ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے براہِ راست ہمکلام ہوتا ہے۔ جب عوام نے اسے بھی برداشت کر لیا تو پھر کہا میں ظلی نبی ہوں۔ اس پر جب لوگوں نے دو۔۔ سے شروع کی تو پھر قدم پیچھے کی طرف لوٹاتے اور اپنے موقف سے ہٹ کر عوام کو خاموش کرنے کی کوشش کی پھر حالات جب ذرا اپنے حق میں سازگار معلوم ہوئے تو نبوت کا اعلان کر دیا لیکن اس دعوے پر کبھی بھی سختی کے ساتھ قائم نہ رہے۔ لوگوں کے انکار و احساسات کے ساتھ ہمیشہ آنکھ مچولی کھیلتے رہے اور عقیدتمندوں کے ذہنوں کو تاویلات کے گورکھ دھندوں میں ایسا الجھایا کہ وہ بیچارے زندگی کے بعد بھی اس امر کا فیصلہ نہ کر سکے کہ اس مدعی کو کس زمرہ میں شامل کیا جائے۔

ایک سچا نبی چونکہ اللہ تعالیٰ سے براہِ راست ہدایت حاصل کرتا ہے اس لیے اُس کے قلب و دماغ میں کسی قسم کا کوئی شک اور الجھاؤ نہیں ہوتا۔ اس کی ہر بات میں یقین اور وثوق سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لبریز ہوتی ہے۔ حالات کی موافقت یا ناسازگاری اُس کے راستے میں بالکل حائل نہیں ہونے پاتی۔ وہ اپنے متعلق اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کیا ہے اور اسے کس منصب سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اس منصب کے بارے میں اُسے کس حد تک یقین حاصل ہوتا ہے اس کا اندازہ حضوؐر کی حیاتِ طیبہ کے ایک ایک ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ قریشِ مکہ نے جب تنگ آکر حضوؐر کے چچا ابوطالب کے پاس آکر شکایت کی کہ آپ کا بھتیجا ہمارے معبودوں کو گالیاں دیتا ہے، ہمارے دین میں عیب نکالتا ہے اور ہمارے عقلمندوں کو بیوقوف بتاتا ہے اور ہمارے بزرگوں کو گمراہ ٹھہراتا ہے۔ لہٰذا یا تو اب آپ اسے اس کام سے باز کیجیے یا ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم اسے سختی سے روک دیں۔ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اب ہم زیادہ مدت تک اس صورتِ حال کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ابوطالب کفارِ مکہ کے اس چیلنج سے متاثر ہوئے اور کہا:

"اے میرے بھائی کے بیٹے! تمہاری قوم میرے پاس آئی ہے، اور اُس نے یہ یہ باتیں کہی ہیں۔ جو عام لوگوں نے (شکایتاً) اس کے پاس پہنچائی تھیں۔ مجھ پر اور اپنی ذات پر رحم کھاؤ اور مجھ پر ایک ایسا بوجھ نہ ڈالو جس کا میں متحمل نہیں ہو سکتا۔"

چچا کی یہ بے بسی حضوؐر کے پائے ثبات میں کوئی تزلزل نہ پیدا کر سکی کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ کی دستگیری پر کامل اور مکمل بھروسہ تھا اس لیے انہوں نے پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ چچا سے کہا:

یا عم، واللّٰہ لو وضعوا الشمس فی یمینی، والقمر فی یساری علی ان اترک ھذا الامر حتی یظھرہ اللّٰہ أو اھلک فیہ ما ترکتہ [1]	چچا جان، اللہ کی قسم اگر یہ لوگ میری دائیں جانب سورج اور بائیں جانب چاند بھی رکھ دیں کہ میں اس دعوت سے دستبردار ہو جاؤں، تو ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں اس فرض کی بجا آوری میں اس وقت

تک منہمک رہوں گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خود اس دعوت کو غالب کر دے یا میں اس تگ و دو میں جانِ جاں آفریں کے حوالہ کر دوں۔

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد اول ص ۲۶۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ہے وہ حیرت انگیز شعور و ادراک جو نبی کو اپنے منصب اور موقف کے بارے میں ہوتا ہے اور یہ ہے وہ زبردست وثوق و اعتماد جو مخبرِ صادق خدا کے لم یزل پر رکھتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام سے چونکہ خداوند تعالیٰ خود ہمکلام ہوتا ہے اس لیے ان کے دل و دماغ کے کسی گوشہ میں تذبذب کا کوئی شائبہ بھی پیدا نہیں ہونے پاتا۔

حضور کے اس فرمان سے، کہ "اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیے جائیں تو میں اپنی دعوت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔" جہاں ایک طرف حضورؐ کے غیر معمولی عزم و استقلال کا اظہار ہوتا ہے وہاں اس میں ایک اور لطیف نکتے کی طرف نہایت بلیغانہ انداز میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی مجھے اللہ تعالیٰ نے جن دلائل و براہین سے نوازا ہے وہ میرے نزدیک سورج اور چاند سے بھی زیادہ منوّر اور واضح ہیں۔ ان کے مقابلے میں شمس و قمر کا نور بالکل ماند ہے۔ براہین الٰہیہ سامنے آجانے کے بعد، اور خالق کائنات کے سورج اور چاند سے زیادہ روشن دلائل دیکھتے ہوئے میرے لیے یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں محض خلق کی مخالفت کے خوف سے انہیں پس پشت ڈال دوں۔

حضور سرورِ عالم کو خداوند تعالیٰ کے ارشادات اور اس کے وعدوں پر کس حد تک بھروسہ تھا اس پر حضورؐ کی پوری زندگی شاہد ہے۔ جب ہم حضورؐ کی حیات طیبہ کے مختلف واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ ایک شخص کے سامنے سے غیب کے سارے حجابات دور کر دیئے گئے ہیں اور وہ ایک قادرِ مطلق خالق کی ذات کو اپنی آنکھوں سے خود دیکھ رہا ہے۔ ایک متصوف بھی ذاتِ حق کے مشاہدہ کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اسے اس مشاہدہ پر اتنا وثوق و اعتماد نہیں ہوتا جتنا کہ ایک نبی کو حاصل ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور خالق کے درمیان پیغام رسانی کا جو سلسلہ قائم ہوتا ہے وہ چونکہ خود اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت اور نگرانی میں قائم کرتا ہے اس لیے اس میں نہ تو انبیاء علیہم السلام کی داخلی کیفیات اور قلبی واردات دخیل ہونے پاتی ہیں اور نہ ہی ان کا ذاتی مشاہدہ اور مطالعہ وحی و الہام پر کسی طرح اثر انداز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتا ہے خداوند تعالیٰ پر اس غیر معمولی وثوق و اعتماد کے واقعات سے سیرت کی ساری کتب بھری پڑی ہیں۔ ہم یہاں بطور مثال صرف ایک واقعہ نقل کرتے ہیں۔

حضورؐ کی جان مسلمانوں کو کس حد تک عزیز تھی اُس کا اندازہ ہر وہ مسلمان کر سکتا ہے جس نے حضورؐ اور اُن کے جان نثار صحابہ کے باہمی تعلق کا ایک سرسری سا جائزہ بھی لیا ہے۔ حضورؐ کے رفقاء کار اُن کے دلسوز فدائی تھے اور حضورؐ کے معاملے میں ان کے احساسات اتنے نازک تھے کہ دشمنوں کے نرغے میں گھر کر بھی جب ان سے یہ کہا جاتا کہ کیا تم اس بات کو گوارا کرتے ہو کہ تمہاری جگہ تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خون گرا دیا جاتا تو انہوں نے غیر معمولی جرأت اور دلسوزی کے ساتھ فوراً یہ کہا کہ ظالمو! تم تو میری جان بخشی کے صلے میں حضورؐ کے مقدس خون گرانے کے متعلق بات کر رہے ہو مجھے یہ بات تو گوارا ہے کہ دشمنوں میرا سر تن سے جدا کر دے اور وہ خاک و خون میں تڑپنے لگے لیکن مجھے یہ بات کبھی گوارا نہیں ہو سکتی کہ میری جان کے بدلے حضورؐ کے پائے مبارک میں ایک کانٹا بھی چبھ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کی جان کی آپ کے صحابہ ہر وقت حفاظت اور پاسبانی کرتے رہے۔ چنانچہ سیرت کی کتب میں درج ہے کہ معرکہ بدر میں جب ایک رات حضور سرور دو عالم آرام فرما رہے تھے تو سعد بن معاذ نے چوکیداری کا فرض انجام دیا، احد کے دن محمد بن مسلمہ نے یہ خدمت انجام دی۔ خندق کے دن زبیر ابن العوام نے حضورؐ کے خیمہ کے گرد پہرہ دیا۔ ان اصحاب کے علاوہ ابن بشر اور بہت سے دوسرے خوش نصیب لوگ ایسے تھے جنہیں یہ سعادت نصیب ہوئی۔ مگر جس وقت حضورؐ پر یہ آیت نازل ہوئی وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ یعنی اب اللہ خود تمہاری جان کی حفاظت کرے گا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے درمیان تشریف لائے اور اپنے جان نثاروں کو اس کے متعلق مطلع کر دیا اور جو لوگ اس خدمت پر مامور تھے اُن سے کہا: اب آپ تشریف لے جائیں کیونکہ اللہ نے میری حفاظت کا خود ذمہ لے لیا ہے[۱]۔

---

[۱] زاد المعاد جلد اول صفحہ ۶۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خدا کے ارشاد پر یہ غیر معمولی یقین اور اعتماد اُسی شخص کے قلب و دماغ میں پیدا ہو سکتا ہے جس کا خداوند تعالیٰ سے براہِ راست تعلق قائم ہو چکا ہو۔ جو مقدس ذات خداوند تعالیٰ کے وعدے پر اپنی جان کی حفاظت اور نگرانی اس کے ہاتھ میں براہِ راست دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے اور اپنے خدمت گزاروں سے صاف طور پر کہہ دیتی ہے کہ وہ اب اُس کے لیے فکر مند نہ ہوں، اس کے متعلق عقل یہ باور نہیں کر سکتی کہ وہ غلطی سے اپنے ذاتی احساسات کو الہامی کیفیات سمجھ لے گی۔ تاریخ کے اوراق نے اس امر کی شہادت بھی دی ہے کہ خداوند تعالیٰ کا دعویٰ پورا ہو کر رہا، اور اللہ کا رسول دشمنوں کے نرغے میں گھر کر بھی محفوظ و مامون رہا اور اس کی جان کی حفاظت، اور پاسبانی خود خالقِ کائنات نے کی۔ حضورؐ کے خداوند تعالیٰ پر اس غیر معمولی اعتقاد کا اعتراف بڑے بڑے متعصب مستشرقین تک نے کیا ہے:

"ہم خواہ انہیں نبی کہیں یا شاعر لیکن ہم ایک بات ضرور محسوس کرتے ہیں کہ جو الفاظ اُن کی زبان فیض ترجمان سے ادا ہوتے وہ کسی عام انسان کے الفاظ نہیں ہو سکتے۔ یوں نظر آتا ہے کہ اُن الفاظ کا تعلق اشیاء کی اصل حقیقت سے تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ حضورؐ کا دنیا کی سب سے بڑی حقیقت (یعنی ذات باری تعالیٰ) سے براہِ راست تعلق قائم ہو چکا تھا۔"

(ٹور اندری "محمد" لندن ۱۹۳۶ ص ۲۴۷)

"حضورؐ خدائے واحد کے رسول تھے، اور اپنے اس مرتبہ اور منصب کا شعور و ادراک انہیں زندگی کے ہر لمحہ حاصل رہا، یہ حقیقت کبھی بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائی۔ اور جو پیغام وہ خدا کی طرف سے لیکر دنیا میں تشریف لائے تھے وہ ہمیشہ اُن کے سامنے رہا۔" (لین پول دی پرافٹ اینڈ اسلام ص ۳۹)

(باقی)

© rasailojaraid.com